○

بن ہو، ابر ہو، تیز ہوا ہو
پَو بھی پھٹی، طوفاں بھی اُٹھا
آج کی کلیاں کب چٹکیں گی
چاند بھی ساکن، وقت بھی ساکن
پت جھڑ میں کیوں پھول نہ ڈھونڈے
بیلیں سی بل کھاتی ہیں جب
تو نے یوں شرما کر دیکھا
میری تنہائی کی دعا ہے
وقتِ سحر یوں کلیاں چٹکیں
انساں کا معیار یہی ہے
دِیئے بجھے ہیں، پھُول کھلے ہیں

تیرے حُسن کا دِیا جلا ہو
اب کوئی کیا جانے کیا ہو
شاید مستقبل کو پتا ہو
شاید تو کچھ سوچ رہا ہو
جس نے تجھے کھو کر پایا ہو
کوئی سہارا ٹوٹ چلا ہو
جیسے تھک کر دِیا بجھا ہو
تیرے ساتھ بھری دنیا ہو
جیسے تیرا نام لیا ہو
خوب دُکھی ہو، خوب اچھا ہو
شاید یہ شہراہِ صبا ہو

تُو کہتا ہے تارا ٹُوٹا
اور اگر آنسو ٹپکا ہو!

(۱۹۴۹ء)

○

چراغِ مردہ کو اک بار اور اُکساؤں
دیا بجھے تو سحر کا فریب کیوں کھاؤں

خدا کے کام جو آئے، خدا بنائے گئے
میں سوچتا ہوں کہ انسان ہی کے کام آؤں

میں رنگ و نغمہ و رقصِ حیات ہوں یعنی
ضمیرِ دہر ہوں، شاہوں کے ہاتھ کیا آؤں

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

ستارے ٹوٹ کے کلیوں کے روپ میں چٹکیں
ذرا زمین کے پندار کو جو اُکساؤں

کسی کی زلف بھی منّت پذیرِ شانہ سہی
مگر میں گیسوئے گیتی تو پہلے سُلجھاؤں

کئی برس سے مجھے مل رہا ہے درسِ خودی
یہی کہ تیرگیوں میں ہوا سے ٹکراؤں

میں اب سے دُور فرشتوں کے گیت لکھتا رہا
یہ آرزو ہے کہ اب آدمی کو اپناؤں

(۱۹۵۰ء)

احمد ندیم قاسمی

○

قرارِ جاں بھی تمہی، اضطرابِ جاں بھی تمہی
مرا یقیں بھی تمہی ہو، مرا گماں بھی تمہی

تمھاری جان ہے نکہت، تمھارا جسم بہار
مری غزل بھی تمہی، میری داستاں بھی تمہی

یہ کیا طلسم ہے، دریا میں بن کے عکسِ قمر
رُکے ہوئے بھی تمہی ہو، رواں دواں بھی تمہی

خدا کا شکر، مرا راستہ معیّن ہے
کہ کارواں بھی تمہی، میرِ کارواں بھی تمہی

تمہی ہو جس سے ملی مجھ کو شانِ استغنا
کہ میرا غم بھی تمہی، غم کے رازداں بھی تمہی

نہاں ہو ذہن میں وجدان کا دھواں بن کر
افق پہ منزلِ ادراک کا نشان بھی تمہی

تمام حسنِ عمل ہوں، تمام حسنِ بیاں
کہ میرا دل بھی تمہی ہو، مری زباں بھی تمہی

(۱۹۵۲ء)

احمد ندیم قاسمی

○

گو دُھند میں تا کمر گیا چاند
نظروں میں مگر ٹھہر گیا چاند

راہوں کو ٹٹولتے رہے تم
بادل میں اُدھر اُتر گیا چاند

جب ہجر کی رات چاند ڈوبا
دل چیخ اُٹھا کہ مر گیا چاند

اے دردِ فراق کے اندھیرو
کیا ہو گئے گُل؟ کدھر گیا چاند

اُجلا سا غبار ہے اُفق پر
اس راہ سے کس کے گھر گیا چاند

اے ٹُوٹتے آسرے، لُٹے ہم
اے سوچتے رہگزر، گیا چاند

تم کاش، کِرن کی چاپ سُنتے
میرے لیے در بدر گیا چاند

اب آئے ہو آفتاب لے کر
ظلمات سے جب گزر گیا چاند

آنسو بھی نہیں کہ دل کو رو لیں
تارے بھی گئے، جدھر گیا چاند

(دسمبر ۱۹۵۲ء)

○

حیراں حیراں کونپل کونپل، کیسے کِھلتے پھُول یہاں
تنے ہوئے کانٹوں کے ڈر سے پُوجی گئی بُول یہاں

کلیاں نوکِ سناں سے چٹکیں، غُنچے گٹ کے شگفتہ ہُوے
کاش یہ فصلِ خونِ بہاراں اور نہ کھینچے طُول یہاں

شاید آج بھی جاری ہے آدم کا سلسلۂ اُفتاد
تھی نہ وہاں جنّت بھی گوارا اور قبول ہے دُھول یہاں

یارو یہ سنّاٹا توڑو، گیت نہیں تو چیخ سہی،
رُلوانا قانون یہاں کا، رو لینا معمول یہاں

پَل پَل میں تاریخ چُھپی ہے، گھڑی گھڑی گرداں ہے ندیمؔ
ایک صدی کی ہار بنے گی ایک نظر کی بھُول یہاں

(دسمبر ۱۹۵۲ء)

○

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شِکن یاد آئی

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی

چاند جب دُور اُفق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

دن شعاعوں سے الجھتے گزرا
رات آئی تو کِرن یاد آئی

(فروری ۱۹۵۳ء)

○

اک دمکتا ذہن بھی ہوں، اک سلگتا دل بھی ہوں
''اپنا ماضی بھی ہوں میں اور اپنا مستقبل بھی ہوں''

میری دنیا پر اگر ظلمت مُسلّط ہے تو کیا
ابر میں لپٹی ہوئی شب کا مہِ کامل بھی ہوں

میں بظاہر اک بھنور ہوں چیختے جذبات کا
لیکن اس بپھرے ہُوئے طوفان کا ساحل بھی ہوں

کفر کے انکار کی عظمت کا گو منکر نہیں
میں کسی قوّت کے حُسنِ ربط کا قائل بھی ہوں

زندگی تیرا ارادہ - موت تیرا فیصلہ
سوچتا ہوں، تیرے ہوتے میں کسی قابل بھی ہوں

آبلوں پر جو حِنا باندھے، مجھے یہ بھی بتائے
کیوں بایں درماندگی، وارفتۂ منزل بھی ہوں

شمع، میری چشمِ گریاں - گل، مرے پامال خواب
راندۂ محفل ہوں، محفل میں مگر شامل بھی ہوں

زندگی کا ذائقہ تھا ان لبوں کے لمس میں
فکر کا شاعر ہوں لیکن حسن کا گھائل بھی ہوں

(ستمبر ۱۹۵۷ء)

○

لبِ خاموش سے افشا ہو گا — راز ہر رنگ میں رسوا ہو گا
دل کے صحرا میں چلی سرد ہوا — ابر گلزار پہ برسا ہو گا
تم نہیں تھے تو سرِ بام خیال — یاد کا کوئی ستارا ہو گا
کس توقع پہ کسی کو دیکھیں — کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہو گا
جس بھی فنکار کے شہکار ہو تم — اس نے صدیوں تمھیں سوچا ہو گا
زینتِ حلقۂ آغوش بنو — دُور بیٹھو گے تو چرچا ہو گا
ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو — درد چمکے گا تو پھر کیا ہو گا
آج کی رات بھی تنہا ہی کٹی — آج کا دن بھی اندھیرا ہو گا
کس قدر کرب سے چٹکی ہے کلی — شاخ سے گُل کوئی ٹوٹا ہو گا
عمر بھر روئے فقط اس دھن میں — رات بھیگی تو اُجالا ہو گا

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہو گا

(ستمبر ۱۹۵۸ء)

احمد ندیم قاسمی

○

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی رَوا لگتا ہے

کوہِ غم پر سے جو دیکھوں، تو مجھے
دشت، آغوشِ فنا لگتا ہے

سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے، خفا لگتا ہے

موسمِ گُل میں سرِ شاخ گلاب
شعلہ بھڑکے تو بجا لگتا ہے

مسکراتا ہے جو اس عالَم میں
بخدا ، مجھ کو خدا لگتا ہے

اتنا مانوس ہوں سنّاٹے سے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے

اُن سے مل کر بھی نہ کافور ہُوا
درد یہ سب سے جُدا لگتا ہے

نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شکر کرتا ہوں ، گِلہ لگتا ہے

اس قدر تُند ہے رفتارِ حیات
وقت بھی رشتہ بپا لگتا

(مئی ۱۹۶۰ء)، (اکلوتی بہن سعیدہ بانو کی وفات پر)

○

گُل ترا رنگ چُرا لائے ہیں گُلزاروں میں
جل رہا ہوں بھری برسات کی بوچھاروں میں

مجھ سے کترا کے نکل جا، مگر اے جانِ حیا
دل کی لَو دیکھ رہا ہوں ترے رخساروں میں

حسن بیگانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
غنچے کھلتے ہیں تو بِک جاتے ہیں بازاروں میں

ذکر کرتے ہیں ترا مجھ سے، بعنوانِ جفا
چارہ گر پھُول پرو لائے ہیں تلواروں میں

زخم چھپ سکتے ہیں، لیکن مجھے فن کی سوگند
غم کی دولت بھی ہے شامل مرے شہکاروں میں

منتظر ہیں کہ کوئی تیشۂ تخلیق اُٹھائے
کتنے اصنام ابھی دفن ہیں کہساروں میں

مجھ کو نفرت سے نہیں، پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

(نومبر ۱۹۶۰ء)

○

انقلاب اپنا کام کر کے رہا
بادلوں میں بھی چاند اُبھر کے رہا

ہے تری جستجو گواہ، کہ تُو
عمر بھر سامنے نظر کے رہا

رات بھاری سہی ، کٹے گی ضرور
دن کڑا تھا مگر گزر کے رہا

گُل کھلے آہنی حصاروں میں
یہ تعطّر مگر بِکھر کے رہا

عرش کی خلوتوں سے گھبرا کر
آدمی فرش پر اُتر کے رہا

ہم چھپاتے پھرے دلوں میں چمن
وقت پھولوں پہ پاؤں دَھر کے رہا

موتیوں سے کہ ریگِ ساحل سے
اپنا دامن ندیم بھر کے رہا

(دسمبر ۱۹۶۰ء)

○

(نذرِ غالبؔ)

ہنسی آتی ہے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر
گھٹا کعبے سے اُٹھتی ہے، برستی ہے برہمن پر

خمارِ خانہ ویرانی میں یوں محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے بجلیوں نے رنگ چھڑکے ہیں نشیمن پر

چلو، دشتِ طلب میں ایک انساں تو نظر آیا
جو وہ مانے تو اپنی جان رکھ دوں دستِ رہزن پر

جفائے دوست کی مجھ سے شکایت ہو تو کیونکر ہو
وہ دیوانہ ہوں جس کو پیار آ جاتا ہے دشمن پر

شمیمِ گُل تو رنگِ گُل کے بس میں بھی نہیں رہتی
خزاں کیوں ہاتھ پھیلاتی رہی دیوارِ گلشن پر

قفس کی تیرگی کچھ کم نہ تھی ہول آفرینی کو
کرن کے روپ میں تلوار رکھ دی کس نے روزن پر

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے، خدا جانے
محبت کا کوئی دھبّا نہیں ہے جن کے دامن پر

عناصر سے نمٹ کر، کیا بتاؤں، کس سے نمٹے گا
ندیمؔ اب آدمی کے ہاتھ ہیں خود اپنی گردن پر

(مارچ ۱۹۶۱ء)

○

تُو بگڑتا بھی ہے، خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ
پھُول کِھلتے ہیں ترے شعلہ آواز کے ساتھ

ایک بار اور بھی کیوں عرضِ تمنّا نہ کروں
کہ تو انکار بھی کرتا ہے عجب ناز کے ساتھ

لَے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی
رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ

تُو پکارے تو چمک اُٹھتی ہیں میری آنکھیں
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ

جب تک ارزاں ہے زمانے میں کبوتر کا لہو
ظلم ہے، ربط رکھوں گر کسی شہباز کے ساتھ

پست اتنی تو نہ تھی میری شکست اے یارو
پر سمیٹے ہیں، مگر حسرتِ پرواز کے ساتھ

پہرے بیٹھے ہیں قفس پر، کہ ہے صیّاد کو وہم
پر شکستوں کو بھی اک ربط ہے پرواز کے ساتھ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

(جنوری ۱۹۶۲ء)

احمد ندیم قاسمی

○

تُجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں، جہاں تک دیکھوں
حُسنِ یزداں سے تجھے حُسنِ بُتاں تک دیکھوں

تُو نے یوں دیکھا ہے، جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا
میں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
میں ترا حُسن، ترے حُسنِ بیاں تک دیکھوں

میرے ویرانۂ جاں میں، ترے غم کے دم سے
پھول کھلتے نظر آتے ہیں، جہاں تک دیکھوں

وقت نے ذہن میں دُھندلا دیے تیرے خدوخال
یوں تو میں ٹوٹتے تاروں کا دھواں تک دیکھوں

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

اِک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

(۱۹۶۳ء)

○

ہر لمحہ اگر گریز پا ہے
تو کیوں مرے دل میں بس گیا ہے

چلمن میں گلاب کھل رہا ہے
یہ تو ہے کہ شوخیِ صبا ہے

میں نے تجھے دیکھا جب سے پیارے
ہر چیز پہ، پیار آ رہا ہے

جُھکتی نظریں بتا رہی ہیں
میرے لیے تُو بھی سوچتا ہے

میں تیرے کہے سے چُپ ہوں، لیکن
چُپ بھی تو بیانِ مدعا ہے

ہر دیس کی اپنی اپنی بولی
صحرا کا سکُوت بھی صدا ہے

اک عمر کے بعد مسکرا کر
تُو نے تو مجھے رُلا دیا ہے

اُس وقت کا میں حساب کیا دوں
جو تیرے بغیر کٹ گیا ہے

ماضی کی سناؤں کیا کہانی
لمحہ لمحہ گزر گیا ہے

مت مانگ دعائیں، جب محبت
تیرا میرا معاملہ ہے

کس دل سے کروں وِداع تجھ کو
ٹُوٹا جو ستارہ، جل بجھا ہے

اب تجھ سے جو ربط ہے تو اتنا
تیرا ہی خدا مرا خدا ہے

رونے کو اب اَشک بھی نہیں ہیں
یا عِشق کو صبر آگیا ہے

اب کس کی تلاش میں ہیں جھونکے
میں نے تو دِیا بجھا دیا ہے

کچھ کھیل نہیں ہے عشق کرنا
یہ زندگی بھر کا رت جگا ہے

(دسمبر ۱۹۶۲ء، مارچ ۱۹۶۴ء)

○

اِحساس میں پھول کِھل رہے ہیں
پت جھڑ کے عجیب سلسلے ہیں

کچھ ایسی شدید تیرگی ہے
آنکھوں میں ستارے تیرتے ہیں

دیکھیں، تو ہوا جمی ہوئی ہے
سوچیں، تو درخت جُھومتے ہیں

سُقراط نے زہر پی لیا تھا
ہم نے جینے کے دُکھ سہے ہیں

وہ غم تو ہمیں ہیں جاں سے پیارے
جو غم ترے پیار نے دیے ہیں

ہم تجھ سے بگڑ کے جب بھی اُٹھے
پھر تیرے حضور آگئے ہیں

ہم عکس ہیں ایک دوسرے کا
چہرے یہ نہیں ہیں، آئنے ہیں

لمحوں کا غبار چھا رہا ہے
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

سورج نے گھنے صنوبروں میں
جالے سے شعاعوں کے بُنے ہیں

یکساں ہیں فراق و وصل دونوں
یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں

پا کر بھی تو نیند اُڑ گئی تھی
کھو کر بھی تو رت جگے ملے ہیں

جو دن ترے پیار میں کٹے تھے
ماضی کے کھنڈر بنے کھڑے ہیں

جب تیرا جمال ڈھونڈتے تھے
اب تیرا خیال ڈھونڈتے ہیں

ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور
جب خوش بھی ہوئے تو رو دیے ہیں

لو دل کی خبر بھی، چارہ سازو
دامن کے تو چاک سی لیے ہیں

ہم زندہ ہیں، اے فراق کی رات
پیاری، ترے بال کیوں کُھلے ہیں

(جولائی ۱۹۶۴ء)

احمد ندیم قاسمی

○

کسی کی چاپ نہ تھی، چند خشک پتّے تھے
شجر سے ٹوٹ کے جو فصلِ گل پہ روئے تھے

ابھی ابھی تمہیں سوچا تو کچھ نہ یاد آیا
ابھی ابھی تو ہم اک دوسرے سے بچھڑے تھے

تمہارے بعد، چمن پر جب اک نظر ڈالی
کلی کلی میں خزاں کے چراغ جلتے تھے

ہم اک نظر کے گنہگار، کیا خدا سے کہیں
تمہی کہو، کہ یہ تم تھے جو دل میں اُترے تھے

تمام عمر وفا کے گناہ گار رہے
یہ اور بات، کہ ہم آدمی تو اچھے تھے

ہمارے ذہن پہ پتھراؤ بے سبب تو نہ تھا
کہ ہم نے تیرہ دلوں سے ستارے مانگے تھے

یہ فخر بھی تو بہت تھا، کہ جو ہنسے ہم پر
وہ کوئی غیر نہیں تھے، تمام اپنے تھے

کسی کا جسم حسیں تھا، کسی کی روح حسیں
غرض یہاں کے سب انسان حُسن پارے تھے

شبِ خموش کو تنہائی نے زباں دے دی
پہاڑ گونجتے تھے، دشت سنسناتے تھے

وہ اک ہی بار مَرے، جن کو تھا حیات سے پیار
جو زندگی سے گریزاں تھے، روز مرتے تھے

نئے خیال اب آتے ہیں ڈھل کے آہن میں
ہمارے دل میں کبھی کھیت لہلہاتے تھے

اب ایک شخص جو خوش ہے، فقط وہی خوش ہے
وہ درد مند کہاں، جن میں درد بٹتے تھے

یہ ارتقاء کا چلن ہے، کہ ہر زمانے میں
پُرانے لوگ، نئے آدمی سے ڈرتے تھے

ندیمؔ، جو بھی ملاقات تھی، ادھوری تھی
کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے

(اگست ۱۹۶۷ء)

.....☆.....

احمد ندیم قاسمی

○

اب تو شہروں سے خبر آتی ہے دیوانوں کی
کوئی پہچان ہی باقی نہیں ویرانوں کی

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھریاں سر پہ اُٹھائے ہُوئے ایمانوں کی

اپنی پوشاک سے ہشیار! کہ خدّامِ قدیم
دھجیاں مانگتے ہیں اپنے گریبانوں کی

صنعتیں پھیلتی جاتی ہیں، مگر اس کے ساتھ
سرحدیں ٹوٹتی جاتی ہیں گلستانوں کی

دل میں وہ زخم کِھلے ہیں، کہ چمن کیا شے ہیں
گھر میں بارات سی اُتری ہُوئی گلدانوں کی

ایک اک یاد کے ہاتھوں میں چراغوں بھرے طشت
کعبۂ دل کی فضا ہے کہ صنم خانوں کی

اُن کو کیا فکر ، کہ میں پار لگا، یا ڈوبا
بحث کرتے رہے ساحل پہ جو طوفانوں کی

مقبرے بنتے ہیں زندوں کے مکانوں سے بلند
کس قدر اَوج پہ تکریم ہے انسانوں کی

تیری رحمت تو مسلّم ہے، مگر یہ تو بتا
کون بجلی کو خبر دیتا ہے کاشانوں کی

ابھی تکمیل کو پہنچا نہیں ذہنوں کا گداز
ابھی دنیا کو ضرورت ہے غزل خوانوں کی

(ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے، تو جھونکا ہوا کا تھا

اس حسنِ اتفاق پہ لُٹ کر بھی شاد ہوں
تیری رضا جو تھی، وہ تقاضا وفا کا تھا

دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی
یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں!
تُو سامنے تھا، اور تصوّر خدا کا تھا

چُھپ چُھپ کے روؤں، اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا تھا

اُٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پُجاری بقا کا تھا

ٹُوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہُوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا

حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیم
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

(دسمبر ۱۹۶۷ء)

احمد ندیم قاسمی

○

میں زندۂ جاوید باندازِ دگر ہوں
بھیگے ہوئے جنگل میں سُلگتا ہوا گھر ہوں

ذرّہ ہوں، بظاہر میں دکھائی نہیں دیتا
مجھ میں کبھی جھانکو تو میں تاحدِّ نظر ہوں

دشمن بھی جو چاہے تو میری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ، سرِ راہگزر ہوں

ظلمت مرا ماحول، تجلّی مری منزل
میں شب کا مسافر ہوں، مگر شمعِ سحر ہوں

بے دَم ہوں، مگر ساتھ نہ چھوڑوں گا تمہارا
تم لوگ مسافر ہو تو میں گردِ سفر ہوں

یہ سوچ کے پتّھر مجھے مارو مرے یارو
کچھ بھی ہوں، تمہارا ہی تو میں آئینہ گر ہوں

یارب، مجھے اس کربِ مسلسل سے رہا کر
مسجودِ ملائک ہوں تو کیوں خاک بسر ہوں

قدرت سے ودیعت ہیں مجھے رنگ بھی، رس بھی
ارزاں ہوں، کہ میں شاخِ بُریدہ کا ثمر ہوں

(جون، جولائی ۱۹۶۸ء)

○

کسے معلوم تھا، اس شے کی بھی تجھ میں کمی ہو گی
گماں تھا، تیرے طرزِ جبر میں شائستگی ہو گی

مجھے تسلیم ہے، تو نے محبت مجھ سے کی ہو گی
مگر حالات نے اظہار کی مہلت نہ دی ہو گی

میں اپنے آپ کو سُلگا رہا ہوں اس توقّع پر
کبھی تو آگ بھڑکے گی، کبھی تو روشنی ہو گی

شفق کا رنگ کتنے والہانہ پن سے بکھرا ہے
زمیں۔بامِ اُفق پر۔ اپنے سورج سے ملی ہو گی

سنا ہے، عالَمِ لاہوت میں پھر زندہ ہونا ہے
مگر دھرتی سے کٹ کر زندگی کیا زندگی ہو گی

وہ وقت آئے گا، چاہے آج آئے، چاہے کل آئے
جب انساں دشمنی، اپنے خدا سے دشمنی ہو گی

کبھی گر جرم ٹھہرا تذکرہ حُسن و محبت کا
تو کس کافر سے ملک و قوم کی بھی شاعری ہو گی

(ستمبر ۱۹۶۹ء)

○

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

تیرا در چھوڑ کے مَیں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا، صحرا میں بکھر جاؤں گا

تیرے پہلو سے جو اُٹھوں گا، تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا ، جدھر جاؤں گا

اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا

تیرا پیمانِ وفا راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاؤں گا، مر جاؤں گا

چارہ سازوں سے الگ ہے مرا معیار، کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا

اب تو خورشید کو ڈوبے ہوئے صدیاں گزریں
اب اسے ڈھونڈنے مَیں تابہ سحر جاؤں گا

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

(اکتوبر ۱۹۶۹ء)

○

میں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا
ایک ذرّہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا

اس قدر پیار ہے انساں کی خطاؤں سے مجھے
کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

اے خدا! پھر یہ جہنم کا تماشا کیا ہے؟
تیرا شہکار تو فی النار نہیں ہو سکتا

اے حقیقت کو فقط خواب سمجھنے والے!
تُو کبھی صاحب اسرار نہیں ہو سکتا

تُو جو اک موجۂ نکہت سے بھی چونک اُٹھتا ہے
حشر آتا ہے تو بیدار نہیں ہو سکتا

سرِ دیوار یہ کیوں نرخ کی تکرار ہوئی
گھر کا آنگن کبھی بازار نہیں ہو سکتا

راکھ سی، مجلسِ اقوام کی چٹکی میں ہے کیا؟
کچھ بھی ہو، یہ مرا پندار نہیں ہو سکتا

اس حقیقت کو سمجھنے میں لُٹایا کیا کچھ
میرا دشمن مرا غمخوار نہیں ہو سکتا

میں نے بھیجا تجھے ایوانِ حکومت میں مگر
اب تو برسوں ترا دیدار نہیں ہو سکتا

تیرگی، چاہے ستاروں سے سفارش لائے
رات سے مجھ کو سروکار نہیں ہو سکتا

وہ جو شعروں میں ہے اک شے پسِ الفاظ ندیمؔ
اس کا الفاظ میں اظہار نہیں ہو سکتا

(مئی ۱۹۷۳ء)

○

میں ہوں تیرا کہ تُو شیدا میرا
بس یہ جھگڑا رہا تیرا میرا

کیا یہ کچھ کم ہے، کہ دل توڑ کے بھی
تُو نے پندار نہ توڑا میرا

اک ترے حسن سے نسبت کے طفیل
لوگ تکتے رہے چہرہ میرا

چاند ڈوبا تو میں اُبھرا، لیکن
تو نے رستہ ہی نہ دیکھا میرا

رو رہا ہوں، مگر آنسو کم ہیں
میرا سینہ ہے کہ صحرا میرا

اپنی فطرت میں تو ساون ہوں، مگر
عمر بھر ابر نہ برسا میرا

زندہ ہونے کی ہوس لاکھوں میں
اور مصلوب مسیحا میرا

اک خدا ہے کہ اُترتا ہی نہیں
حشر صدیوں سے ہے برپا میرا

سُوئے خورشید سفر جُرم نہیں
کیوں تعاقب میں ہے سایہ میرا

خون میں ڈوب کے، اے صبحِ وطن
رنگ کیسا نکھر آیا میرا

ہار جانا مری فطرت میں نہیں
رات اس کی ہے، ستارہ میرا

ڈوبنا سیکھ جو پانا ہے مجھے
میری گہرائی، کنارا میرا

شعر ہوتے ہی، نکل آتا ہے
آستیں سے یدِ بیضا میرا

دوست بھی چونک کے تکتے ہیں مجھے
میرا دشمن ہوا چرچا میرا

میں تو مر جاؤں گا، لیکن یارو
کبھی آئے گا زمانہ میرا

(جون ۱۹۷۳ء)

○

اک بُت مجھے بھی گوشۂ دل میں پڑا ملا
واعِظ کو وہم ہے کہ اُسی کو خدا ملا

حیرت ہے، اس نے اپنی پرستش ہی کیوں نہ کی
جب آدمی کو پہلے پہل آئنہ ملا

خورشیدِ زندگی کی تمازت غضب کی تھی
تو راہ میں ملا تو شجر کا مزا ملا

دیکھا جو غور سے تو مجسّم تجھی میں تھا
وہ حُسن جو خیال سے بھی ماورا ملا

سینے میں تیری یاد کے طوفان جب اُٹھے
ذہن اک بگُولا بن کے ستاروں سے جا ملا

مجھ سے بچھڑ کے، یوسفِ بے کارواں ہے تُو
مجھ کو تو، خیر، درد ملا، تجھ کو کیا ملا

دن بھر جلائیں میں نے اُمیدوں کی مشعلیں
جب رات آئی، گھر کا دِیا تک بُجھا ملا

یا رب، یہ کس نے ٹکڑے کیے روزِ حشر کے
مجھ کو تو گام گام پہ محشر بپا ملا

محکوم ہو کچھ ایسا کہ آزاد سا لگے
انساں کو دورِ نَو میں یہ منصب نیا ملا

ماضی سے مجھ کو یوں تو عقیدت رہی، مگر
اس راستے میں جو بھی نگر تھا، لُٹا ملا

دشتِ فراق میں وہ بصیرت ملی، ندیمؔ
جو مجھ سے چھن گیا تھا، وہی جا بجا ملا

(اگست ۱۹۷۳ء)

○

کتنے بہت سے روپ ہیں، حضرتِ آدمی کے بھی
ولولے داوری کے بھی، وسوسے کافری کے بھی

عشق جنوں سہی، مگر عشق فقط جنوں نہیں
ہوتے ہیں کچھ مُطالبے عشق سے آگہی کے بھی

بت شکنی کا مرتبہ یوں تو بلند ہے، مگر
اپنے ہی خاص لطف ہیں صنعتِ آزری کے بھی

یوں تو سمیٹ شوق سے توشۂ آخرت، مگر
وہ جو ہیں زندہ، ان پہ کچھ قرض ہیں زندگی کے بھی

کیسے مرا فقیہہِ شہر میری سمجھ میں آسکے
ڈھنگ قلندری کے بھی، رنگ سکندری کے بھی

یوں تو ہے شعر کا جمال، لفظ کا لَے سے اتصال
میں نے چکھے ہیں ذائقے اس میں پیمبری کے بھی

ظلمتِ عمر کاٹ دی میں نے یہ سوچ کر ندیمؔ
چادرِ شب میں جابجا، تار ہیں روشنی کے بھی

(ستمبر ۱۹۷۳ء)

○

جب ترا حکم ملا، ترک محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا، کہ قیامت کر دی

تجھ سے کس طرح میں اظہارِ تمنا کرتا
لفظ سُوجھا تو معانی نے بغاوت کر دی

میں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے
تو نے جا کر تو جدائی مری قسمت کر دی

تجھ کو پوجا ہے کہ اصنام پرستی کی ہے
میں نے وحدت کے مفاہیم کی کثرت کر دی

مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے
تیری اُلفت نے محبت مری عادت کر دی

پوچھ بیٹھا ہوں میں تجھ سے ترے کُوچے کا پتہ
تیرے حالات نے کیسی تری صورت کر دی

کیا ترا جسم، ترے حسن کی حدّت میں جلا
راکھ کس نے تری سونے کی سی رنگت کر دی

(ستمبر ۱۹۷۳ء)

○

جی چاہتا ہے، فلک پہ جاؤں
سورج کو غروب سے بچاؤں

بس میرا چلے جو گردشوں پر
دن کو بھی نہ چاند کو بجھاؤں

میں چھوڑ کے سیدھے راستوں کو
بھٹکی ہوئی نیکیاں کماؤں

امکان پہ اس قدر یقیں ہے
صحراؤں میں بیج ڈال آؤں

میں شب کے مسافروں کی خاطر
مشعل نہ ملے تو گھر جلاؤں

تنہائی ہے، عمر کا سفر ہے
دشمن ہی کو ہمسفر بناؤں

یہ بھی تو نماز کی قضا ہے
جو روٹھ گئے، انہیں مناؤں

جب مجھ کو تلاش ہے خدا کی
آفاق میں کس طرح سماؤں

اشعار ہیں میرے استعارے
آؤ تمہیں آئینے دکھاؤں

یوں بٹ کے، بکھر کے رہ گیا ہوں
ہر شخص میں اپنا عکس پاؤں

آواز جو دوں کسی کے در پر
اندر سے بھی خود نکل کے آؤں

اے چارہ گرانِ عصرِ حاضر
فولاد کا دل کہاں سے لاؤں

ہر رات دعا کروں سحر کی
ہر روز نیا فریب کھاؤں

ہر جبر پہ صبر کر رہا ہوں
اس طرح کہیں اُجڑ نہ جاؤں

گھر ڈوب رہے ہیں تیرگی میں
قبروں پہ مگر دِیے جلاؤں

رونا بھی تو طرزِ گفتگو ہے
آنکھیں جو رُکیں تو لب ہلاؤں

ماحول ہی سازگار کب تھا
حسرت ہی رہی کہ مسکراؤں

خود کو تو ندیم آزمایا
اب مر کے خدا کو آزماؤں

(اکتوبر ۱۹۷۵ء)

○

روز، اِک نیا سورج ہے تری عطاؤں میں
اعتماد بڑھتا ہے صبح کی فضاؤں میں

شاید ان دیاروں میں خوش دلی بھی دولت ہے
ہم تو مسکراتے ہی گھر گئے گداؤں میں

بھائیوں کے جمگھٹ میں، بے رِدا ہوئیں بہنیں
اور سَر نہیں چُھپتے، ماؤں کی دعاؤں میں

بارشیں تو یاروں نے کب کی بیچ ڈالی ہیں
اب تو صرف غیرت کی راکھ ہے ہواؤں میں

سُونی سُونی گلیاں ہیں، اُجڑی اُجڑی چوپالیں
جیسے کوئی آدم خور، پھر گیا ہو گاؤں میں

جب کسان، کھیتوں پر دوپہر میں جلتے ہیں
لوٹتے ہیں سگ زادے، کیکروں کی چھاؤں میں

تم ہمارے بھائی ہو بس ذرا سی دوری ہے
ہم فصیل کے باہر، تم محل سراؤں میں

خون رسنے لگتا ہے، ان کے دامنوں سے بھی
زخم چھپ نہیں سکتے، ریشمی رِداؤں میں

دوستی کے پردے میں، دشمنی ہوئی اتنی
رہ گئے فقط دشمن، اپنے آشناؤں میں

امن کا خدا حافظ جب کہ نخل زیتوں کا
شاخ شاخ بٹتا ہے، بھوکی فاختاؤں میں

ایک بے گنہ کا خون، غم جگا گیا کتنے!
بٹ گیا ہے اِک بیٹا، بے شمار ماؤں میں

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

خاک سے جُدا ہو کر، اپنا وزن کھو بیٹھا
آدمی معلّق سا رہ گیا خلاؤں میں

اب ندیمؔ منزل کو ریزہ ریزہ چُنتا ہے
گھِر گیا تھا بے چارہ، کتنے رہ نماؤں میں

(جنوری ۱۹۷۶ء)

○

اب ترے رُخ پر محبت کی شفق پُھولی، تو کیا
حسن برحق ہے، مگر جب بُجھ چکا ہو جی، تو کیا

جب ترا کہنا ہے، تو تقدیر کا محکوم ہے
تو نے نفرت کی تو کیا، تو نے محبت کی، تو کیا

اب کہاں سے لاؤں وہ آنکھیں جو لذّت یاب ہوں
دستِ باراں نے مرے در پر جو دستک دی، تو کیا

ہجر کی شب، اس تصوّر سے کسے تسکین ہو
سامنے رہتی ہے تیری شکل پیاری سی، تو کیا

جذب ہو جائیں گے خاکِ بے حسی میں سات رنگ
آنسوؤں کے ساتھ ٹپکا ہے اگر خوں بھی، تو کیا

دُھوپ، کرنوں میں پرو لی جائے گی ساری نمی
رات بھر پھولوں نے دستِ شب سے شبنم پی، تو کیا

اب تو سیلابوں سے جل تھل ہوگئیں آبادیاں
اب مرے کھیتوں کی لاشوں پر گھٹا برسی، تو کیا

چور جس گھر میں پلیں، اس گھر کو کیسے بخش دیں
لُوٹنے آئے ہیں ہم لوگوں کو اپنے ہی، تو کیا

ہم نہیں ہوں گے تو پھر کس کام کی تحسینِ شعر
روشنی اک روز ان لفظوں سے پُھوٹے گی، تو کیا

دُور کی آہٹ تو آ پہنچی ہے اب سر پر ندیمؔ
آگہی نے مدّتوں کے بعد کروٹ لی، تو کیا

(فروری ۱۹۷۶ء)

احمد ندیمؔ قاسمی

○

وہ جو اک عمر سے مصروف عبادات میں تھے
آنکھ کھولی تو ابھی عرصۂ ظلمات میں تھے

صرف آفات نہ تھیں ذاتِ الٰہی کا ثبوت
پھول بھی دشت میں تھے، حشر بھی جذبات میں تھے

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا ، نہ منشائے خدا
حادثے مجھ پہ جو گزرے، مرے حالات میں تھے

میں نے کی حدِّ نظر پار، تو یہ راز کُھلا!
آسماں تھے تو فقط میرے خیالات میں تھے

میرے دل پر تو گریں آبلے بن کر بوندیں
کون سی یاد کے صحرا تھے جو برسات میں تھے

اس سبب سے بھی تو میں قابلِ نفرت ٹھہرا
جتنے جوہر تھے محبت کے ، مری ذات میں تھے

صرف شیطاں ہی نہ تھا منکرِ تکریم ندیمؔ
عرش پر جتنے فرشتے تھے، مری گھات میں تھے

(جولائی ۱۹۷۶ء)

○

اہلِ ثروت پہ خدا نے مجھے سَبقَت دے دی
اس کی رحمت نے قلم کی مجھے دولت دے دی

خیمہ زن حسن کو دیکھا افقِ فردا پر
میں نے فن میں، اِسی اِک خواب کو وسعت دے دی

وہ کبھی مہر، کبھی ماہ، کبھی دن اور کبھی رات
اتنی کثرت کو مرے ذوق نے وحدت دے دی

اپنے اللہ سے شکوے کا محل ہو تو کروں
غم دیئے، ساتھ ہی غم سہنے کی راحت دے دی

اُس کا احساں، کہ جو نفرت کا ہدف ہیں کب سے
مجھ کو اُن خاک نشینوں کی محبت دے دی

مجھ سے کافر پہ فرشتے کا اترنا ہی غضب
پھر ستم یہ، اسے انسان کی سیرت دے دی

آئنہ دیکھتے ہی، میں نے پلٹ کر دیکھا
عشق نے جیسے مجھے بھی تری صورت دے دی

(اگست ۱۹۷۶ء)

○

نہ وہ سِن ہے فرصتِ عشق کا، نہ وہ دِن ہیں کشفِ جمال کے
مگر اب بھی دل کو جواں رکھیں وہی شعبدے خدوخال کے

یہ جو گردِ بادِ حیات ہے، کوئی اس کی زد سے بچا نہیں
مگر آج تک تری یاد کو میں رکھوں سنبھال سنبھال کے

میں امین و قدر شناس تھا، مجھے سانس سانس کا پاس تھا
یہ جبیں پہ ہیں جو لکھے ہوئے، یہ حساب ہیں مہ و سال کے

وہ کبھی شفق کا فسوں کہیں، کبھی گُل کہیں کبھی خوں کہیں
کہ ہیں میری صبحِ عروج میں ابھی رنگ شامِ زوال کے

مری حسرتوں کو ہرا رکھے، مری کشتِ جاں کو بھرا رکھے
یہ یقیں، کہ مجھ پہ کھلیں گے در کسی روز بادِ شمال کے

شبِ تار سے نہ ڈرا مجھے، اے خدا! جمال دکھا مجھے
کہ ترے ثبوت ہیں بیشتر تری شانِ جاہ و جلال کے

کوئی کوہکنؔ ہو کہ قیسؔ ہو، کوئی میرؔ ہو کہ ندیمؔ ہو
سبھی نام ایک ہی شخص کے، سبھی پھول ایک ہی ڈال کے

(مارچ ۱۹۷۷ء)

احمد ندیم قاسمی

○

مداوا حبس کا، ہونے لگا آہستہ آہستہ
چلی آتی ہے وہ موجِ صبا آہستہ آہستہ

ذرا وقفے سے نکلے گا، مگر نکلے گا چاند آخر
کہ سورج بھی تو مغرب میں چُھپا آہستہ آہستہ

کوئی سنتا تو اک کُہرام برپا تھا ہواؤں میں
شجر سے ایک پتّا جب گِرا آہستہ آہستہ

تعجب میرے جل بجھنے پہ کیوں ہے میرے پیاروں کو
میں اپنی آنچ میں تپتا رہا آہستہ آہستہ

ابھی سے حرفِ رخصت کیوں جب آدھی رات باقی ہے
گل و شبنم تو ہوتے ہیں جدا آہستہ آہستہ

مجھے منظور، گر ترکِ تعلق ہے رضا تیری
مگر ٹُوٹے گا رشتہ درد کا آہستہ آہستہ

غرورِ مُدّعا، شرمندۂ اظہار کیوں ہوتا
میں اشکوں ہی میں سب کچھ کہہ گیا آہستہ آہستہ

پھر اس کے بعد شب ہے، جس کی حد صبحِ ابد تک ہے
مغنّی! شام کا نغمہ سنا آہستہ آہستہ

شبِ فرقت میں جب نجمِ سحر بھی ڈوب جاتا ہے
اُترتا ہے مرے دل میں خدا آہستہ آہستہ

میں شہرِ دل سے نکلا ہوں سب آوازوں کو دفنا کر
ندیمؔ اب کون دیتا ہے صدا آہستہ آہستہ

(اگست ۱۹۸۰ء)

احمد ندیم قاسمی

○

تنگ آ جاتے ہیں دریا جو کہستانوں میں
سانس لینے کو نکل جاتے ہیں میدانوں میں

خیر ہو دشت نوردانِ محبت کی، کہ اب
شہر بستے چلے جاتے ہیں بیابانوں میں

اب تو لے لیتا ہے باطن سے یہی کام جنوں
نظر آتے نہیں اب چاک ، گریبانوں میں

مال چوری کا جو تقسیم کیا چوروں نے
نصف تو بٹ گیا بستی کے نگہبانوں میں

کون تاریخ کے اس صِدق کو جھٹلائے گا
خیر و شر دونوں مقیّد رہے زندانوں میں

جستجو کا کوئی انجام تو ظاہر ہو ندیمؔ
اِک مسلماں تو نظر آئے مسلمانوں میں

(نومبر ۱۹۸۷ء)

احمد ندیم قاسمی

○

مہ و مشتری پہ اُتر کے بھی میں زمین سے نہ جدا ہوا
مجھے اپنی خاک سے عشق ہے کہ میں خاک کا ہوں بنا ہوا

سفرِ حیات کے موڑ پر میں یہ سوچ کر بھی رُکا نہیں
کفِ پا ہیں میرے جلے ہوئے ، مرا راستہ ہے تپا ہوا

میں ترے کرم کا ہوں معترف ، ترا شکر کیسے ادا کروں
مرے زخم تری عطائیں ہیں ، مرا درد تیرا دیا ہوا

مری منزلوں کے نشاں ہیں گُم ، اِسی راکھ میں، اِسی ریت میں
مری مشعلیں ہیں بجھی ہوئی ، مرا قافلہ ہے لُٹا ہوا

مری عمر گزری ہے دوستو! اِسی اک عجوبے کی کھوج میں
مجھے کاش آپ دِکھا سکیں کوئی دل جو ہو نہ دُکھا ہوا

وہ جو ایک نقطۂ نور تھا ، مری عقل میرا شعور تھا
جو سمجھ لیا تو صنم بنا ، نہ سمجھ سکے تو خدا ہوا

وہ جو مر گئے ہیں ندیمؔ وہ تو فنا کے گھاٹ اُتر گئے
مگر ایک دوست جو زندہ ہے ، وہ پلٹ سکا نہ گیا ہوا

(جون ۱۹۸۹ء)

○

اندھیری رات کو یہ معجزہ دکھائیں گے ہم
چراغ اگر نہ جلا ، اپنا دل جلائیں گے ہم

ہماری کوہ کنی کے ہیں مختلف معیار
پہاڑ کاٹ کے، رستے نئے بنائیں گے ہم

جنونِ عشق پہ تنقید اپنا کام نہیں
گُلوں کو نوچ کے کیوں تتلیاں اُڑائیں گے ہم

جو دل دُکھا ہے تو یہ عزم بھی ملا ہے ہمیں
تمام عمر کسی کا نہ دل دُکھائیں گے ہم

بہت نڈھال ہیں ، سستا تو لیں گے پَل دو پَل
اُلجھ گیا کہیں دامن تو کیوں چُھڑائیں گے ہم

اگر ہے موت میں کچھ لُطف، تو بس اتنا ہے
کہ اس کے بعد خدا کا سُراغ پائیں گے ہم

ہمیں تو قبر بھی تنہا نہ کر سکے گی ندیمؔ
کہ ہر طرف سے زمیں کو قریب پائیں گے ہم

(نومبر ۱۹۸۷ء)

○

ایک ماحول اُچھوتا چاہوں — صحن کے نام پہ صحرا چاہوں
موجِ دریا جہاں چاہے لے جائے — ناخدا کا نہ سہارا چاہوں
کائناتیں مرے خوابوں کی اسیر — اور قدرت سے میں کتنا چاہوں
تربیت میری زمیں نے کی ہے — میں خلاؤں میں لپکنا چاہوں
بخشوانے کو گناہِ آدم — پھر سے فردوس میں جانا چاہوں
دوزخ انسان پہ ہو جائے حرام — رب سے یہ وعدۂ فردا چاہوں
خشک پتّے نہ شجر سے چھینے — بس یہ احسان ہوا کا چاہوں
میری ضد کون کرے گا پوری — شام کو صبح کا تارا چاہوں
میرا ہر کام الگ دنیا سے — جس کو چاہوں اسے تنہا چاہوں

ہجر کی کتنی تمازت ہے ندیمؔ
اب کسی یاد کا سایا چاہوں

(اگست ۱۹۹۴ء)

○

یہ خواب دیکھتا ہوں ، انتظار کرتے ہوئے
تُو آ رہا ہے ستاروں پہ پاؤں دَھرتے ہوئے

ہر ایک فرد کا چہرہ ہے ہوبہو تیرا
میں لُٹ گیا ہوں ترے شہر سے گزرتے ہوئے

تری نگاہِ کرم ہی نے بھر دیا دامن
جھجک رہا تھا میں تجھ سے سوال کرتے ہوئے

یہ دیکھ کر مجھے خود پر بڑا ترس آیا
تُو رو رہا تھا مرے ذہن سے اُترتے ہوئے

حیات ایک سمندر ہے ، وہ بھی طوفانی
تمام عمر کٹی ڈوبتے اُبھرتے ہوئے

نہیں ہے کیوں کوئی حد تیری کائناتوں کی؟
خدا سے پوچھتا رہتا ہوں ، ڈرتے ڈرتے ہوئے

(جولائی ۲۰۰۱ء)

○

لب پہ جب اُس کے پلٹنے کی دُعا آتی ہے
اِک دِیا دل کے دریچے میں جَلا آتی ہے

جب اُترتی ہیں مرے دل میں پرانی یادیں
کتنی بچھڑی ہوئی کُونجوں کی صدا آتی ہے

سوچتا ہوں کہ کہیں قیس نہ ہو گریہ کُناں
بھیگی بھیگی سی جو صحرا سے ہَوا آتی ہے

میرے باطن میں کوئی قافلہ ہے محوِ سفر
سانس لیتا ہوں تو آوازِ دِرا آتی ہے

اِس حوالے سے، کہ شہپارۂ تخلیق ہے وہ
مجھ کو انسان سے خوشبوئے خدا آتی ہے

نوعِ انساں کے تقدس کی ہے سوگند ندیم
اپنے دشمن سے بھی اب مجھ کو حیا آتی ہے

۳ جون ۲۰۰۳ء (جناح ہسپتال میں)